بتیسّواں سفر ۔ حجِ مبارک

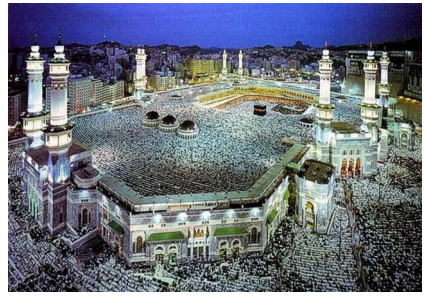

دعائیں دِل سے نکلیں تو کامیاب ہوتی ہیں۔ ہماری بہن نے ایک کاسینو میں دِل سے ہمارے لئے دعا کی تھی کہ ہم حج پر جائیں گے۔ ہم نے لاس ویگاس سے واپس آ کر یہاں ڈزنی لینڈ اور یونیورسل اسٹوڈیو کا ایک چکر لگایا اور اسی میں وقت گزرتا رہا کہ جولائی آ گیا۔ اس سال لاس انجلس میں ہمارے رشتہ دار بہن، بھائی اور بھابھی حج پر جا رہے تھے۔ ہمارے بیٹوں نے ہم سے کہا کہ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی چلے جائیں۔ ہم تو تیار تھے۔ اس وقت ہم اپنے بھائی کے ہاں سِمّی ویلی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم نے بھی انہی کے مشورہ پر اُن کے ٹریول ایجنٹ کو اپنا پاسپورٹ اور پیسے وغیرہ بھیج دیئے۔ انہوں نے ٹریول ایجنٹ سے پہلے ہی فون پر بات کر

لی تھی کہ ویزا اور ٹکٹ دونوں ہی وقت پر ملنا ضروری تھے۔ اب ہمیں صرف محرم کی ضرورت تھی جو کہ یہ ہمارے رشتہ والے بھائی تھے۔ یہ ڈیلٹا ایئر لائنز میں کام کرتے تھے جہاں انہیں چھٹی نہیں مل رہی تھی۔ ہم اور ہماری بہن نے اللہ پر بھروسہ کر کے اپنی خریداری مکمّل کی جس میں سفید قمیض اور شلوار کے لئے کپڑا لیا، اسپنج کی چپلیں، چادریں، سر پر باندھنے والے رومال اور بغیر خوشبو والا صابن۔ ایسا صابن تلاش کرنا بہت مشکل ثابت ہوا کیونکہ امریکہ میں تو ہر صابن ایک سے بڑھ کر خوشبودار ہوتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ محنت لگی اور ہمارے بیٹے اِس سے بہت زِچ ہوئے۔ رات کے دو دو بجے تک بیٹھ کر ہم نے اپنی پسند کے کپڑے سیئے۔ اس طرح سب تیاریاں ہوچکیں تو معلوم ہوا کہ ڈیلٹا نے ہمارے بھائی کو چھٹی بھی دے دی۔ اب ہمیں پتہ تھا کہ ان تینوں کی نشستیں تو ہو چکی ہیں، لیکن ہماری نشست کا ٹریول ایجنٹ نے منتظر فہرست (ویٹنگ لسٹ) میں نام رکھا ہوا تھا۔ لیکن آخری ہفتے میں یہ بھی کام ہو گیا۔ اب ہمیں مینجائٹس بیماری سے مدافعتی ٹیکے لگوانے تھے۔ یہ ٹیکے ایسے تھے کہ تین دن میں وقفے وقفے سے لگتے تھے۔ ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ لہذا ہم نے اپنے ڈاکٹر بیٹے اعجاز کے ایک دوست ڈاکٹر کے ساتھ جا کر ایک ہی گھنٹے کے وقفے سے یہ ٹیکے لگوائے، شاید یہ کوئی زیادہ مہنگا طریقہ تھا۔ اس طرح یہ کام بھی ختم ہوا تو اب ہم جانے کو بالکل تیار تھے۔ ٹیکے لگانے والے ڈاکٹر نے ہم سے حج اور اس کی ضروریات کے بارے میں بہت سوالات کئے۔ یہ لوگ بہت کھوجی ہوتے ہیں۔ اسی طرح ہماری بھانجی سے ایک دن ان کے پارکنگ لاٹ کے رکھوالے نے پوچھا، ''محترمہ، کیا یہ حجاب پہننا لازمی ہے؟'' اِنہوں نے کہا، ''ہاں۔ ہم پاکستانی مسلم ہیں اور اس لئے یہ ضروری ہے''۔ اس کے کچھ دن بعد وہ شخص انہیں ایک کتاب دکھا کر کہنے لگا، ''مِس، یہ دیکھیں میں یہ کتاب لایا ہوں۔ اس میں اسلام پر گفتگو ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے اِسے پڑھنا''۔ یہ لوگ اسلام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ لیکن جتنوں کو اسلام کے بارے میں پتہ چلتا ہے وہ اِس سے صحیح معلومات کے بعد کافی مرعوب ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ بہت پڑھتے ہیں ایسا ادب اور لٹریچر جو معلومات بڑھائے، خصوصاً عقیدے، رسم و رواج یا مذہب جو بھی ہو، شعور ہو جستجو ہو، اسے پڑھنا انہیں پسند ہے۔ یہ نہیں کہتے کہ ہمارے خیال میں تو ایسا نہیں، بلکہ ایسا ہوتا ہے۔

لاس انجلس سے ہم ۴/ جولائی ۱۹۸۹ء کی صبح کے ۱۱/ بجے کی پرواز سے چلے۔ ہم چار افراد تھے، اور ہمیں رخصت کرنے والے بہت تھے۔ یہاں سے اس سے پہلے ایک قافلہ حج کے لئے جا چکا تھا اور یہ دوسرا قافلہ تھا۔ یونائیٹیڈ ایئر لائنز کی اس پرواز سے ہم نیویارک پہنچے۔ یہاں مختلف ممالک کے حج پر جانے والے

لوگ جمع ہورہے تھے۔ ایک عجیب سا سماں تھا۔ ہم سے ملنے ہمارے ہونے والے داماد حسن اوران کی والدہ ایئرپورٹ پر آگئی تھیں۔ امریکہ کے مختلف شہروں سے پروازیں حاجیوں کو لے کر شام کے تین چار بجنے تک آتی رہیں۔ یہاں سے ہمیں سعودی ایئرلائنز سے جانا تھا جو قافلوں کی شکل میں یہ پروازیں لے کر جا رہی تھی۔ ہمارے قافلہ کے ۴۵۰ / افراد پہلے ہی سے جمع تھے اوران کے لئے صرف ایک شخص ایسا تھا جو انگریزی جانتا تھا۔ ایئرلائنز کے باقی تمام کارکن سعودی تھے جو کہ بظاہر صرف عربی جانتے تھے۔ اب پاسپورٹ کی جانچ کی قطار میں لگنے کے بعد برا حال تھا کہ یہ قطار چیونٹیوں سے بھی زیادہ سست رفتاری سے سِرک رہی تھی۔ قریب پہنچنے پر وجہ پتہ لگی۔ یہاں پاسپورٹ کی جانچ پہلے عربی شخص کرتا جو کہ صرف ویزا کی جانچ کررہا تھا کہ یہ سعودی قانون کے مطابق ہیں کہ نہیں۔ پھر انگریزی بولنے والا کارکن اس میں امریکی ویزا اور گرین کارڈ کی ضروری مہریں امریکی قانون کے مطابق دیکھ رہا تھا۔ یہ واحد انگریزی دان تھا، لہذا کبھی کہیں بھاگتا، اور کبھی کہیں اور کسی سے آواز سن کر وہاں چلا جاتا۔ پھر مزے کی بات یہ کہ جو لوگ امریکی پاسپورٹ رکھتے تھے، ان کی قطاریں الگ تھیں۔ جن مسافروں کے پاکستانی یا دوسرے غیرامریکی پاسپورٹ اور گرین کارڈ تھے، اُن کی قطار الگ تھی، اور جو گرین کارڈ کے بغیر پاکستانی یا دوسرے غیرامریکی پاسپورٹ کے حامل تھے، ان کی قطاریں الگ۔ اُس پر طرّہ یہ کہ ان تین نفریوں میں بھی مردوں کی الگ اور عورتوں کی الگ قطاریں تھیں۔ ہمارے پاس امریکی ویزا تھا، لیکن ابھی گرین کارڈ نہیں تھا اور ہم پاکستانی پاسپورٹ کے مالک تھے۔ اِس وقت ہمارے لئے امریکہ سے نکلنے کے بعد واپس آنا ناممکن تھا کیونکہ ہمارے متعدد داخلہ امریکی ویزے پر داخلے کی آخری تاریخ مارچ کی تھی، اور یہ جولائی کا مہینہ تھا۔ ہم امریکہ میں تو قانونی طور پر تھے، لیکن اگر ہم ملک چھوڑتے تو واپس نہیں آسکتے تھے۔ یہ بات نہ ہمارے دھیان میں تھی، نہ ٹریول ایجنٹ نے دیکھی، اور نہ ہی سعودی سفارتخانے والوں نے۔ قسمت دیکھیئے کہ یہاں سعودی ایئرلائنز کے عملے نے بھی اس کا خیال نہیں کیا کہ ہم واپس کس طرح داخل ہوں گے۔

ہمارے بھائی اور بھاوج امریکی پاسپورٹ کے حامل تھے اور ایک دوسری قطار میں تھے۔ ہمیں خیال یہ ہوا کہ ہمیں کہیں الگ الگ جہازوں میں نہ بھیج دیں کیونکہ اِن مسافروں کو دو جہازوں میں بھیجا جانے والا تھا۔ ہم نے اپنے بھائی سے کہا کہ اس کا انتظام بھی کریں، اور انہوں نے کسی سے کہہ سُن کر اس بات کو بھی طے کرلیا۔ اب ہم نے اپنا پاسپورٹ جب کاؤنٹر پر دیا تو یہ کارکن عربی بولنے والے تھے۔ ہم نے اس سے کہہ

دیا کہ عربی نہیں آتی تو اس نے انگریزی بولنے والے کو بلایا۔ اس شخص نے بغیر کچھ دیکھے ہوئے پاسپورٹ پر مہر لگائی، اور ہم سے کہا، ''گو دِس وے''۔ یہاں نیویارک میں جولائی میں گرمی بہت ہوتی ہے اور ہمیں پسینے آرہے تھے، مگر اِس شخص کی یہ بات سُن کر ہمارے ذہن کو کافی ٹھنڈک کا احساس ہوا، لگا کہ اب ہم واقعی حج پر جا رہے تھے۔

جہاز رات کے ۱۰/ بجے روانہ ہوا تو اندر اللہ اکبر کے نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ ہمیں تھکن اور نیند تو تھی ہی، صبح ۵/ بجے سے اُٹھے ہوئے تھے، اور اِس وقت لاس انجلس کے حساب سے شام کے ۷/ بج رہے تھے۔ سارے مسافر لباسِ حج پہنے ہوئے تھے۔ اب نماز کا وقت ہوا تو سب کے سب وضو کرنے گئے اور گیلے گیلے چپل لے کر واپس آئے جس سے پورا جہاز گیلا ہو گیا۔ جہاز میں تمام رنگ و نسل کے لوگ تھے اور نمعلوم کہاں کہاں کے لوگ تھے یہ۔ مگر ارادۂ سفر اور مقصد سب کا ایک تھا۔ گفتگو اور طور وطریق سب الگ، مگر جذبۂ ایمان کی چمک سب کے چہروں سے نمایاں تھی۔ اِس وقت تک رات بیت چکی تھی اور ۵/ جولائی شروع ہو چکی تھی۔ ہم اسی میں چند گھنٹوں کے لئے سو گئے۔ جہاز سعودی عرب کے حساب سے ۴/ ذالحجہ ۱۴۰۹ھ، بمطابق ۶/ جولائی بروز بدھ، دوپہر کو جدّہ کے نئے حج ٹرمینل پر پہنچا۔

جہاز کی کھڑکی ہی سے ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں غضب کی گرمی تھی۔ ہر طرف ریتیلا اور بنجر ہوائی اڈّہ تھا جس میں کھجور کے چند درخت لگے تھے۔ اِس کے دخول (امیگریشن) کے حصّے میں بے حساب کاؤنٹر بنے تھے اور اُن پر نمبر درج تھے۔ ہماری پرواز نمعلوم کتنے قافلے لائی تھی۔ ہر قافلے کا ایک معلّم یا میرِ کارواں تھا، اور قافلے کے تمام شرکاء کے پاسپورٹ اس ہی کے پاس رہتے تھے۔ ہمارے پاسپورٹ بھی ان صاحب کے پاس گئے۔ یہ صاحب اس کے ذمّہ دار تھے کہ اس کے قافلے میں تمام شرکاء کی رہائش، سفرخرچ اور واپسی کا انتظام مکمل رہے۔ یہاں لوگ شش و پنج میں تھے اور سب سے بڑی پریشانی پاسپورٹ کی تھی جس سے ہر ایک ہی پریشان تھا۔ کچھ لوگ اپنے دخول کے کاؤنٹر پر جاتے اور سوالات کرتے، لیکن وہاں کا بندہ عربی کے علاوہ کچھ نہیں جانتا تھا اور اس لئے کچھ سمجھا نہیں سکتا تھا۔ پھر وہ شخص خود بھی غائب ہو گیا۔ غالباً تنگ آ گیا تھا۔

اِدھر سے فارغ ہوئے تو ہمارے بھائی نے اپنے سالے کو فون کیا جو جدّہ میں کئی سالوں سے انجینئرنگ کی کسی کمپنی میں کام کرتے تھے۔ وہ نہیں ملے تو سب نمعلوم کس بات کا انتظار کرنے لگے۔ غالباً سب

ہی تھک گئے تھے۔ہمیں بھوک لگی تو ہم ٹہلتے ہوئے کچھ دور چلے اور یہاں کچھ دُکانیں نظر آئیں۔لوٹے، گلاس، چپل، جائے نماز، تولیہ، چادر وغیرہ سب کچھ ہی دستیاب تھا۔ایک طرف کھانوں اور پھلوں کی دُکانیں تھیں۔ سارے دُکاندار پاکستانی اور بنگلہ دیشی تھے۔کھانا لیا، دوتھرماس خریدے، ایک میں پانی اور ایک میں چائے بھروائی، اور ایک چٹائی نما بستر اور ایک ہوا سے بھرا تکیہ لیا۔ایک لوٹا خریدا۔یہ سامان لے کر وہاں سے ایک لڑکا ہمارے ساتھ اُدھر آیا جہاں ہماری بہن، بھائی، اور بھابھی بیٹھے تھے۔سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا جو بالکل پاکستانی مزے کا تھا۔

نماز کا وقت ہوا تو ہم وضو کے لئے چلے۔ایئرپورٹ بہت بڑا، بہت ٹھنڈا اور بہت ہوادار تھا۔باہر درجۂ حرارت کم ازکم ۱۲۰°/درجہ (۴۹°/سنٹی گریڈ) ہوگا، لیکن اندر بالکل ٹھنڈ تھی۔زنانہ حمام میں گئے تو یہاں ہر دومنٹ کے بعد صفائی کی گاڑیاں آرہی تھیں اور کوڑے دان خالی کر کے لے جاتیں۔کئی عورتیں مستقل صفائی کررہی تھیں۔مگر وہی کہ برتنے والوں کو کیسے سمجھایا جائے۔غسل خانے ہوں یا باہر وضو کے لئے نل، کوئی بھی جگہ خالی نہیں تھی۔کچھ عورتیں غسل کررہی تھیں، کوئی کپڑے دھورہی تھیں، تو کوئی کھانے کے برتن اور بوتلیں دھورہی تھیں۔اب یہاں بھی قطار میں کھڑے ہوئے اور جب باری آئی تو وضو کیا، اور زمین پر پڑے ہوئے پانی سے بچتے بچاتے، اپنے لئے بھی ایک لوٹے میں پانی بھر کر ساتھ لے آئے۔ہمیں لاس انجلس میں بتا دیا گیا تھا کہ یہاں پانی کا خیال رکھنا ہے کہ پیٹ کی خرابی کے بہت امکانات تھے۔پھر گرمی میں پسینہ زیادہ نکلنے کے الگ نقصانات تھے۔اس کے لئے نمک کی ڈلیاں، چینی، لیموں اور خاص دوائیں ساتھ رکھی تھیں۔ہم نے بہت سے حاجیوں کو چولھے اور مٹی کا تیل لاتے ہوئے دیکھا۔ان چیزوں پر پابندی ہے کہ ان سے آگیں بہت لگتی ہیں، لیکن ہم نے دیکھا کہ پاکستانیوں نے بے جگری سے اس قانون کو توڑا۔افسوس یہ ہے کہ آگ کے ایسے حادثوں میں پاکستانی ہی زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔

اسی میں رات کے ۱۲/بج گئے۔ابھی تک کسی کے پاسپورٹ واپس نہیں آئے تھے۔لوگ بہت پریشان ہو چلے تھے اور بے چینی اور بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔ہوائی اڈّے پر ہر آدھے ایک گھنٹہ کے بعد ایک پرواز آجاتی اور افراتفری میں اضافہ ہو جاتا۔جہاز سے لوگ اترتے تو آگے میرِ کارواں اپنے ملک کا جھنڈا اور اپنا امتیازی نشان لے کر چلتا، اور پیچھے اس کے ساتھی تکبیریں پڑھتے ہوئے چلتے۔نعرے سُن کر دِل

جھوم اٹھا لیکن بدنظمی بڑھتی گئی۔اسی طرح صبح ہوگئی۔صبح ۹ر بجے ناشتہ سے فارغ ہوئے تو ہماری بھابھی کے بھائی صاحب آ گئے۔ان سے یہاں کے حالات اورطورطریقوں پر گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہاں حج پر کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جو اپنے کسی واقف کار کے پاس چھپ کر رہنے لگتے ہیں، واپس نہیں جاتے۔اس روش کو روکنے کے لئے سعودیوں نے حاجیوں کے پاسپورٹ معلم یامیرِ کارواں کے پاس رکھنے کا قانون نافذ کیا تھا۔

جب مکّہ معظّمہ لے جانے کے لئے بسیں آئیں تو اندازہ ہوا کہ ہر ملک کے لوگوں کے لئے الگ بس تھی۔ہمیں پاکستانیوں کی بس میں بٹھایا گیا کہ اس میں سب اردو یا دوسری پاکستانی زبان بولنے والے تھے۔بس میں ہمیں ایسے پاکستانی ملے جو''اسپانسر ویزا'' پرآئے ہوئے تھے،یعنی ان کے کسی عزیز نے انہیں بلوایا تھا۔بسیں ایک قافلہ کی صورت میں چلیں اور راستے میں دو جگہ ٹھہریں۔ ہر مقام پر دو گھنٹے رُکے۔ان جگہوں پر پاسپورٹ دوبارہ جانچے گئے۔ پوری بس والوں کے پاسپورٹ میرِ کارواں نے ایک تھیلے میں ڈالے ہوئے تھے،اورسعودی حکومت کا افسر سب کو نام بنام پکارتا،تب ہی مسافر اُتر سکتا تھا۔اسی طرح چڑھتے وقت ہر مسافر کا نام پکارا گیا اور گنتی ہوئی۔ایسا لگا کہ جیسے قیدیوں کی بس چل رہی ہو۔ ہر ایک نام ہجّے کر کر کے پکار رہے تھے،اورابھی یہ افسر آدھی ہجّے پر ہوتے کہ مسافر خود ہی اپنا نام لے کر کھڑا ہو جاتا کہ اپنے نام کی اس طرح تلپٹ کسے گوارا ہو۔ ہمارا نام تو عربی ایرانی تھا، پھر بھی یہ اس کو صحیح نہیں کہہ سکے،لہذا ہم نے ان کے کہنے سے پہلے ہی اپنا نام اپنی زبان سے ادا کر دیا۔

مکّہ شہر کے اندر داخل ہوئے تو مینار نظر آنا شروع ہوگئے۔حکم ہے کہ اس وقت لبیک کہنا شروع کر دیا جائے۔اس موقعہ پر بس میں طلبیہ کی آوازیں گونجنے لگیں۔

لَبیکَ اللّٰھُمَّ لَبیک۔ لَبیکَ لَاشرِیکَ لَک لَبیک۔

ہم نے اپنے میرِ کارواں سے اپنے معلّم کے بارے میں پتہ کیا تو خبر ہوئی کہ یہ ایک صاحب حیدر حسن شیخ تھے۔ان کا فون نمبر لیا گیا۔فون کیا تو وہ آرام کر رہے تھے۔شام کو ملاقات کا وعدہ ہوا۔ یہاں ہم سب کو کچھ کمروں کے بیچ کی راہداری میں بٹھایا گیا۔ ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا اور یہ کمروں کی گرم ہوا راہداری میں پھینک رہے تھے۔اس روز مکّہ معظّمہ میں درجہ حرارت ۴۳° سنٹی گریڈ (۱۱۰°ف) تھا۔اب باہر بھی گرمی اوراندر بھی گرمی۔توبہ کرتے رہے کہ مالک، اتنی سی گرمی برداشت نہیں ہوتی تو دوزخ میں کیا ہوگا۔

دوسری طرف غصّہ تھا اپنے لاس انجلس والے حج کے ناظم پر کہ انہوں نے اِس قدر بدانتظامی کا مظاہرہ کیا۔

اسی اثناء میں ایک پاکستانی خاتون وارد ہوئیں اور انہوں نے اپنا گھر ہمیں کرائے پر دینے کا کہا۔ مع کھانے کے، جب قیمت بتائی تو ہم حیران رہ گئے۔ یہ تو نیویارک کے کسی فائیو اسٹار ہوٹل سے بھی زیادہ تھا۔ اب ایک اور معلم بھی بضد تھے کہ ہم اُن صاحب کے اُن کمروں میں ٹھہریں جن کے ایئر کنڈیشنروں کی پھیکی ہوئی گرمی میں ہم اِس راہداری میں تپ رہے تھے۔ مگر ہم لاس انجلس ہی سے حیدر حسن شیخ سے گفتگو کر چکے تھے، اور یہ صاحب مل نہ پا رہے تھے۔ شام ۴/ بجے دوبارہ فون کیا تو یہ سعودی دوپہر کی نیند لے کر جاگ چکے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک نائب روانہ کیا کہ وہ ہمیں کمرہ دلوا سکیں۔ یہاں فون کے ایک یا دو ریال لئے جا رہے تھے، جبکہ یہ مکّہ کے اندرونی نمبر تھے۔ ہر طرف چھین جھپٹ ہو رہی تھی جیسے پاکستان کے ہوائی اڈّوں پر ٹیکسی ڈرائیور کرتے ہیں۔ اب یہ صاحب شام ۵/ بجے ہمیں مختلف کمرے دکھانے لے گئے۔ کچھ ہوٹل کے، اور کچھ مختلف لوگوں کے گھروں میں۔ کچھ گھروں کے کمرے ایسے تاریک اور بدبودار تھے کہ گھن آئے۔ چھوٹی سے چھوٹی گلیوں میں لوگوں نے اپنی کوٹھریوں کے منہ مانگے دام چڑھا رکھے تھے۔ ہم نے ان تمام جگہوں کو رَد کر دیا۔ اب یہ شخص ہمیں حسن حیدر شیخ صاحب کے دفتر واپس لے آیا اور ہمیں یہاں آ کر شیخ کا انتظار کرنے کا کہہ کر خود چلا گیا۔ دوڑ دھوپ کے اس تجربہ سے ہم اتنا پریشان ہوئے کہ اگلی مرتبہ جب ہم اپنے بیٹے اعجاز کے ساتھ عمرہ کرنے گئے تو ہم نے سان فرانسسکو ہی سے مکّہ کے ایک ہوٹل میں کمرے مخصوص کروا لئے تھے۔

اس دفتر میں ہماری کراچی سے آئے ہوئے ایک پاکستانی جوڑے سے ملاقات ہوئی۔ یہ دفتر خانۂ کعبہ کے بہت قریب تھا اور ساتھ ہی کئی پاکستانی بینک بھی تھے۔ کچھ ریستوراں بھی تھے جہاں چاول، قیمہ آلو، نان، اور چائے ٹھنڈا وغیرہ ملتے تھے۔ ہم نے موقع غنیمت دیکھ کر وہیں سے کھانا کھا لیا۔ شام ۶/ بجے شیخ صاحب وارد ہوئے۔ یہ صاحب امریکہ سے آئے ہوئے اہلِ تشیع افراد سے خاص رابطہ میں رہتے تھے۔ بتانے لگے کہ یہاں کے ہوٹل، ریستوراں، بسیں اور دوسری دُکانوں کا ۹۰/ فیصد سے زیادہ دھندہ حج کے زمانے میں ہوتا تھا، یعنی حج یہاں کا سب سے بڑا کاروبار تھا۔ یہ ۶/ ذی الحجہ کا دن تھا اور ۸/ کو ہمیں منیٰ جانا تھا۔ یہاں سب سے آخر میں وہی قافلے آتے تھے جو اپنے ان بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ آتے تھے جو یہاں قیام پذیر تھے۔ اس وقت تک تمام ہوٹل، گھر، راہداریاں، سڑکیں، فٹ پاتھ، اور دُکانوں کے سائبان تک حاجیوں سے

بھر چکے ہوتے ہیں۔ اُس سال یہاں پندرہ لاکھ حاجیوں کا مجمع تھا۔

کمرے نہ ملنے سے حیدر صاحب بھی پریشان ہو گئے، لیکن بارسوخ شخص تھے۔ انہوں نے پہلے سے یہاں پہنچے ہوئے کچھ پاکستانی مسافروں سے کہہ سن کر ہمارے لئے ایک کمرہ خالی کروایا جس میں صرف چار گدّے اور چار تکیے تھے، لیکن چادریں اور تکیوں کے غلاف نہیں تھے۔ ایئر کنڈیشنر تو تھا، لیکن کمزور۔ ریفریجریٹر تھا لیکن بہت چھوٹا کہ سارا کھانا رکھنا مشکل۔ اِس کا دروازہ کھولو تو ساری چیزیں باہر گر پڑتی تھیں۔ لیکن یہ کمرہ خانۂ کعبہ کے قریب تھا اور پاس ہی ایک بنک بھی تھا۔ ہم احتیاطاً چادریں، تکئے کے غلاف اور تولیئے ساتھ لے آئے تھے اور اب یہ کام آئے۔ سب نے، اور شیخ صاحب نے بھی یہی کہا کہ پیسے اور قیمتی چیزیں کمرے میں نہ چھوڑ کر جائیں۔ پھر ہمارے کمرے کی تو کنڈی بھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ہم نے بہت زور دے کر اس جگہ کے مالک سے اس کُنڈی کو صحیح کروایا اور باہر سے خود تالہ خرید کر لائے۔

اب شبِ جمعہ تھی اور سب کا خیال تھا کہ نہا کر عمرہ کرنے چلا جائے۔ سوال یہ اٹھا کہ احرام کی نیت اور احرام باندھنے کہیں اور جایا جائے گا یا یہیں کر سکتے تھے کہ ہم کعبہ کے بالکل برابر ٹھہرے تھے۔ ویسے حج کے لئے ہم میں سے تین افراد نے غسل، احرام اور نیت طیارے پر چڑھنے سے پہلے ہی کر لی تھی، اور طلبیہ بھی کر چکے تھے۔ ایک صاحب رہ گئے تھے۔ سو وہ باہر گئے اور یہ ضروری اعمال پورے کر کے رات کے ۱۱ر بجے آئے تو ہم سب ساتھ مل کر کعبہ میں عمرہ تمتع، حجِ تمتع کی نیت کے ساتھ داخل ہوئے۔ اس کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن یہ کیفیت صرف وہ مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں جو ان تمام چیزوں سے گزر چکے ہیں۔ ہم نے بھی دعا کی کہ خداوند ہر مسلمان کو توفیق عطا فرمائے وہاں جانے کی!

اندر آ کر ۷ر مرتبہ کعبہ کا طواف کیا، پہلے ۳ر چکر تیز اور پھر اگلے ۴ر چکر عام رفتار سے۔ پھر مقامِ ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس وقت حرم میں اور اس کے آس پاس تِل رکھنے کی جگہ نہیں تھی۔ ہم چونکہ ۱۹۷۹ء میں یعنی ۱۰ر سال قبل عمرہ کر چکے تھے لہذا کچھ معلومات بھی تھیں، اور پھر حج کی کتاب بھی ساتھ تھی۔ طواف کے بعد صفّا اور مروہ کے درمیان دوڑ لگا کر سعی کی، بال اور ناخن کُترے، اور ایک جگہ بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگے۔ رات کے تین بجے کے بعد یہاں لوگ زیادہ آنے لگتے ہیں۔ یہ لوگ فجر کی نماز پڑھ کر اور دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتہ کرتے اور پھر سو جاتے تھے۔ ظہر اور عصر کے وقت پھر وہی انسانوں کے

ریلے۔ ہمارے کمرے سے ہر قافلہ گزرتا ہوا نظر آتا تھا، اور ہمارا دن کا وقت یہی دیکھتے نکل جاتا تھا۔

ہفتے کی صبح کو ہم نے حیدر شیخ صاحب سے منیٰ اور عرفات جانے اور دوسرے اخراجات کی ادائیگی کی بات کی۔ انہوں نے بتایا کہ منیٰ میں بھی ٹھنڈے کمروں کا ملنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ نمعلوم کہاں بنائے تھے شیخوں کے لئے کہ ان کے دام ڈاکٹروں یا انجنیئر وں کے بس کی بات تو نہیں تھی۔ پھر بھی ہم نے قربانی کے بکروں کی قیمت وغیرہ کا سارا حساب بے باق کر کے اطمینان کی سانس لی کہ یہ سب واجبات ہیں۔ اس کے بعد ہم نے ہوٹل میں اپنے آس پاس کے کمرے دیکھے۔ ایک ایک کمرے میں دس دس افراد بھی تھے۔ اس لحاظ سے ہم خوش قسمت تھے کہ ایک کمرے میں صرف چار تھے۔ کھڑکی سے دیکھا تو سامنے پہاڑی پر دور دور تک سفید خیمے لگ چکے تھے۔ ان خیموں میں لوگ مٹّی کے تیل کے چولہوں پر کھانا پکاتے ہیں۔ اس قدر گرمی اور تھکن میں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور پھر خیمے اس گرمی میں ایک دم بھڑک اٹھتے ہیں جس کے بعد آگ سے کم اور بھگدڑ میں زیادہ انسان فوت ہو جاتے ہیں۔ ان خیموں میں بجلی کے کولر چلتے تھے اور برف کی سلیں اور تھیلیاں بھی ہوتی تھیں، مگر صحرا میں ۴۶° رسنٹی گریڈ (۱۱۵° رف) درجۂ حرارت کا مقابلہ کرنا کسی طرح آسان نہیں۔ ہمیں بسوں میں بھی برف کی تھیلیاں اور ٹھنڈا پانی دیا جاتا رہا تھا۔

۱۹۷۹ء میں عمرہ کے سفر میں جن سڑکوں کی تعمیر شروع ہوئی دیکھی تھی وہ اب دوطرفہ کشادہ شاہراہیں بن چکی تھیں۔ پرانی عمارتیں گرا کر نئے کثیر المنزلہ ہوٹل بن رہے تھے۔ حج کے دنوں میں یہاں ذاتی کاریں اور سواریاں بند ہوتی ہیں اور صرف حاجیوں کی بسیں اور حکومت کی سواریاں آسکتی ہیں۔ ۸ر ذی الحجہ کو حج کے مراحل شروع ہوئے۔ یاد آیا کہ کیمرہ لانے پر پابندی کی وجہ سے ہم کیمرہ نہیں لائے تھے۔

اس دن ہم نے شروعات طواف اور سعی سے کی۔ یہاں تک سوائے نیت کے باقی چیزیں عمرہ والی ہی تھیں۔ اس کے بعد ہم عرفات روانہ ہوئے۔ دوسروں کی طرح ہمیں بھی اپنے قافلے کی پہچان کا امتیازی نشان ملا تھا جس پر مسافر کے ہوٹل کے بارے میں بھی معلومات تھیں۔ ہر قافلے میں قریب قریب ۵۰۰ رافراد تھے، اور ہمارے قافلے کا نمبر ۵ تھا۔ اگر یہ نشان کھو جائے تو بہت مشکلات ہو سکتی ہیں۔ اب عرفات پر جانے سے پہلے ہم ہوٹل کی لفٹ لے کر نیچے گئے اور یہاں کی دُکانوں سے بسکٹ، نمک، پانی، چائے وغیرہ لیا۔ اِن سب چیزوں کا ایک تھیلا بنا کر اپنے قافلے کے ساتھ بسوں کی قطار میں لگ گئے۔

۹ر ذی الحجہ کو عرفات پہنچے۔ یہاں پر ۹ر ذی الحجہ کو حضرت مسلم بنِ عقیل کی شہادت کا بھی ذکر ہے، لیکن اس کا حج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عرفات مکّہ کے مشرق میں تقریباً ۱۲ر سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں راستے میں مِنیٰ پڑتا ہے لیکن یہاں رُکنا واجب نہیں ہے اور ہم بھی یہاں نہیں رُکے۔ براہِ راست عرفات پہنچے جو ایک کھلا ہوا میدان ہے۔ یہاں کچھ درخت لگائے جا رہے تھے۔ لوگوں کے سائے کے لئے شامیانے اور قناتیں کھڑی تھیں۔ پانی کے نل لگ گئے تھے۔ جا بجا عارضی بیت الخلاء بھی تھے۔ عرفات ہم صبح فجر کے وقت پہنچے اور سارا دن عباداتِ الٰہی میں گزارا۔ ساتھ ہی توبہ استغفار بھی جاری رہتا تھا۔ یہاں روزِ محشر کا سماں ہوتا ہے۔ دور تک چٹیل میدان میں سفید لباس میں مختلف صورتوں اور مختلف دنیاوی رتبوں کے لوگ ایک ہی طرح کے لگ رہے تھے۔ یہاں کھانا نہیں ملتا تھا۔ صرف کینٹین ساتھ ہوتی ہے پانی چائے کے لئے۔ ویسے بھی گرمی میں کھانا سڑ جاتا ہے۔ پھر یہاں کھانے کی خرابی سے ہر سال ڈائریا سے بڑی تعداد میں لوگ مرتے ہیں۔ اس سال ایک قافلے نے یہاں خشک میوہ پر ان لوگوں کے لئے فاتحہ دی جو گذشتہ سال گزر گئے تھے۔ یہ قافلہ پاکستان سے آیا تھا۔ ان قافلوں میں کم عمر لڑکے بھی تھے اور یہ دوسروں کے بہت کام آ رہے تھے۔ فاتحہ کا تبرّک زنانے میں بھی آیا۔ اس میں ایک اُبلا ہوا انڈا اور ایک سیب ہر فرد کے لئے تھا۔ ہم نے جب سب کھا لیا تو ایک مائکروفون پر اعلان ہوا کہ انڈے گرمی سے خراب ہو چکے ہیں، مت کھائیں۔ یہ مائک کراچی کے ایک قافلہ کے پاس تھا جس کے کسی فرد نے دیکھا تھا کہ انڈے خراب ہو گئے تھے۔ اکثر لوگ کھا چکے تھے لہٰذا یہی طے ہوا کہ اگر کچھ گڑبڑ ہوئی تو اللہ مالک ہے اور بانٹنے والا ذمّہ دار ہے۔ شام تک ہماری تھرماس خالی ہو چکی تھی کہ ہم اپنا پانی دوسروں کو بھی پلا رہے تھے۔

مغرب کے ہوتے ہوتے بسیں لگ گئیں۔ سوار ہوئے مشعرالحرام کے لئے کہ یہاں بھی وقوف، یعنی رکنا ضروری ہے۔ مقام مزدلفہ میں رُک کر ۲۱ر کنکریاں چنی جاتی ہیں جو دوسرے دن مِنیٰ میں شیطان کو مارنا ہوتی ہیں۔ یہاں ہم صبح کے ۴ر بجے تک رُکے اور اب ۱۰ر ذی الحجہ ہو گئی تھی تب ہم یہاں سے مِنیٰ روانہ ہوئے۔

مِنیٰ میں دور دور تک خیمے لگے ہوئے تھے۔ ہر خیمہ میں ۲۰ر افراد کے لئے انتظام تھا۔ دو پنکھے

تھے، اور ہر فرد کو ایک بستر بھر یا چٹائی اور دری بھر جگہ ملی تھی۔ پانی کے کولر یہاں دفتر سے لینا پڑتے تھے۔ ہر قافلے کے تمام افراد کے خیمہ برابر تھے اور ان کے گرد احاطہ تھا۔ مشروبات اور کھانے ایک ٹین کے سائبان کے نیچے تھے۔ یہاں سے ہم نے کھانا اور ٹھنڈا لیا، کھایا پیا۔ یہاں بھی سعودی اور دوسرے ملکوں کے نوعمر لڑکے جو حج کے لئے آئے تھے، خدمت خلق بھی کر رہے تھے اور برف اور دوسری چیزیں لا لا کر حاجیوں کو دے رہے تھے۔ ہم نے بھی ان سے برف منگوائی جو حکومت کی طرف سے ملتی ہے۔ لیکن اگر کبھی ٹریفک میں برف کے ٹرک پھنس جاتے تو مشکل ہوتی تھی اور اس وقت برف کے لئے پیسے دینا پڑتے تھے۔ ہمارے ساتھ بھی ایک بار ایسا ہی ہوا تو خیمے کے تمام افراد نے ایک ایک ریال جمع کر کے دیا۔ تمام لوگ بہت دیکھ بھال کے خرچ کر رہے تھے کیونکہ اکثر ممالک حاجیوں کو مختصر سا زرِمبادلہ دیتے ہیں۔

منیٰ پہنچتے ہی ہم نے سب سے پہلے فجر کی نماز ادا کی۔ پھر یہاں قربانی ہوئی اور ہمارے حصّے کے گوشت کی کچھ بوٹیاں ہمیں ملیں۔ قربانی کا باقی سارا گوشت پہلے تو دفن ہو جاتا تھا لیکن اب اسے برف میں لگا کر بذریعہ ہوائی جہاز غریب مسلم ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لوگ باگ قربانی کا گوشت بھون رہے تھے اور سگریٹ بھی پیئے جا رہے تھے۔ ہم نے پہلے کینٹین والوں سے معلوم کیا کہ اگر ان کے پاس گوشت پکانے کا انتظام ہو تو ہم بھی پکوالیں۔ وہاں تو کچھ نہیں تھا۔ ایک صاحب خیموں کے بیچ میں مٹی کے تیل کے چولہے پر گوشت بھون رہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دعوت دی کہ ہم اپنا قربانی کا گوشت بھی اسی چولہے پر پکالیں سو ہم نے پکالیا۔ اتنے میں ہمارے خیموں کی قطار سے دو قطاریں آگے خیموں میں آگ لگ گئی۔ شرطے آ گئے اور تمام خیموں کے باہر کے راستے بند کر دیئے گئے تاکہ بھگدڑ نہ مچ سکے۔ شرطوں نے سب کے سگریٹ، ماچس اور چولہے ضبط کر لئے۔ تجربوں کے بعد سعودی شرطوں نے اچھی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ یہ انتظام بہت پسند آیا۔

جمرات پر تین مقامات پر شیطان کو کنکریاں مارنا ہوتی ہیں، ہر مقام پر ۷۰ کنکریوں کے حساب سے۔ یہاں اس قدر ہجوم تھا کہ مائکروفون پر اعلان ہوا کہ ضعیف خواتین وحضرات کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ اپنے کنکر کسی صحتمند محرم کو دے دیں۔ ہم اور ہماری عزیزہ بہن نے اپنے کنکر اپنے بھائی کو دے دیئے کہ وہ ہماری جگہ مار آئیں۔ یہ کنکریاں چھوٹی چھوٹی تھیں اور ہر کنکری تقریباً ۵۰ گرام کی تھی۔ ہمارے بیٹے کے حساب کے مطابق ۱۵ لاکھ حاجیوں کی اِن کنکریوں کا کل وزن تقریباً ۷۵ ٹن تھا۔ ان کنکریوں کو حکومت کے ٹرک مستقل اٹھا کر

واپس لے جا رہے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جب لوگوں کے پاس کنکریاں ختم ہوگئیں تو وہ جوش میں اپنے ہاتھ کی ہر چیز شیطان کو مارنے لگے۔ ان میں لوگوں کی چھتریاں اور کوکا کولا کے ڈبّے اور بوتلیں تھیں۔ ہمارے پوتی پوتا ہنس کر کہتے ہیں کہ یہاں کوکا کولا کا اشتہار بن سکتا ہے، جو شاید مسلمانوں کو ناگوار گزرے گا۔ منیٰ میں ہم ۱۰/اور ۱۱/ذی الحجہ کے دن رُکے۔ یہیں ہمیں ہماری بیٹی کی دوست کی بہن بھی ملیں جو اپنے بچوں کے ساتھ کوئی منّت بڑھانے آئی تھیں۔ ان ہی کی طرح دوسری عورتیں بھی دیکھیں کہ جنہوں نے اپنی پیٹھ پر بچّے باندھے ہوئے تھے۔ ہمیں خاص طور پر افریقی اور سوڈانی عورتیں یاد رہیں جو بہت قد و قامت کی تھیں اور کہنیاں پھیلا کر اپنا راستہ بنا کر چلتی تھیں۔ پھر یہ ہمیشہ غول میں ہوتی تھیں۔ ہم ان سے مل نہ سکے کہ مقصد صرف حج کرنا تھا۔

۱۲/ذی الحجہ کو قافلہ منیٰ سے روانہ ہوگیا۔ اگر ایک دن اور رک جاتے تو مزید کنکریاں مارنا پڑتیں۔ یہاں شدید گرمی تھی اور لوگ گرمی سے بے ہوش ہو کر گر رہے تھے۔ ہمارے اپنے احاطے میں ایک بنگلہ دیشی خاتون گرمی کی تاب نہ لا کر چل بسی تھیں۔ انہیں ان کے احرام ہی میں دفن کر دیا گیا۔ اب شام کو ہم سب یہاں سے مکّہ روانہ ہوئے اور ڈرائیور تمام راستے بس دوڑاتا رہا۔ بس ایئر کنڈیشنڈ تھی اور ہم سوچ رہے تھے کہ بھئی ذرا آہستہ چلاؤ تو ہم اس میں ٹھنڈ کا فائدہ لیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں اندازہ ہوا کہ مکّہ آجانا چاہئے تھا، لیکن اب تک نہیں آیا تھا۔ ڈرائیور سے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ یہ جناب دوسری سڑک کے ٹریفک سے بچنے کے لئے ایک نئے راستے سے چلے، اور اب راستہ بھول گئے تھے۔ سب پریشان ہوگئے کہ یہ کیسے کرسٹوفر کولمبس سے پالا پڑا۔ اسی میں دوسری صبح ہوگئی۔ ایک جگہ ایک ریستوراں نظر آیا تو لوگوں نے اتر کر کھایا پیا اور پیر سیدھے کئے۔ دو گھنٹے بعد واپس آئے تو ڈرائیور صاحب سو چکے تھے اور کہہ کر سوئے تھے کہ انہیں جگایا نہیں جائے کہ وہ تین دن سے جاگ رہے تھے۔ آدھا دن اس میں نکلا اور دوپہر بعد بس پھر چلی۔

مکّہ معظّمہ واپس پہنچے تو ۱۳/جولائی کی دوپہر ہو چکی تھی اور ابھی الوداعی طواف اور زیارات وغیرہ باقی تھے۔ کعبہ کے اندر مجمع زیادہ تھا اور تمام حاجی اپنا حج پورا کرنے میں مصروف تھے۔ ہم نے اپنے ہوٹل کے کمرے سے یہ سب کچھ دیکھا اور خدا سے دعا کی کہ ہمیں ہمّت دے۔ اتنے میں ہماری بہن کی بیٹی اور داماد ہم سے ملنے آگئے۔ یہ دوبئی میں رہتے تھے اور وہیں کے قافلے کے ساتھ آئے تھے۔ ہم چھ افراد ساتھ اترے اور پھر طواف کرنے چلے۔ نہایت آرام آرام سے قطار در قطار آگے بڑھتے ہوئے طواف والے حصّے میں پہنچے۔

طواف کے سات چکر لگا کر ہم واپس آئے۔ ہمارے بھائی اور بھابھی ہمیں اور بہن کو گھیرے میں لے کر باہر آئے۔ پھر ہم نے سعی کی اور نمازیں پڑھیں۔ خانۂ کعبہ میں داخلہ پر تلاشی لی جاتی تھی اور قینچیاں روک لی جاتی تھیں۔ ہماری قینچی ہمارے بیگ میں پان، تمباکو، پیسے، اور کوئی پندرہ چیزوں کے نیچے تھی، لہذا بچ گئی کہ تلاشی لینے والی پانوں کو ہاتھ نہیں لگانا چاہتی تھی۔ یہ پھر سعی کے بعد بال اور ناخن تراشنے میں سب ہی کے کام آئی۔ ہم سب کا حج پورا ہوا اور ہم نے بہت خوشی سے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ پھر طوافِ وداع کیا۔

اب ہم ایک جگہ بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ ایک پاکستانی صاحب آئے، پوچھنے لگے کہ ہم کراچی کے ہیں۔ ہم نے کہا، ہاں۔ پھر بولے، ''میں اور میری والدہ حج پر آئی تھیں، چوری ہوگئی اور گھڑی تک نکل گئی۔ کچھ مدد کریں''۔ ہم اس طرح کے مانگنے والوں کے بارے میں سُن چکے تھے پھر بھی ہم نے انہیں پانچ ریال دیئے اور کہا کہ وہ پاکستان کے سفارتخانے سے رجوع کریں۔ ابھی یہ صاحب روانہ ہوئے ہی تھے کہ ایک اور صاحب وارد ہوئے اور اسی کہانی کے ساتھ۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ''میاں، کہانی بدل کر آؤ تو شاید کام بنے، اِس کہانی کے پیسے تو دوسرے بندے کو دے چکے ہیں''۔ یہ حضرت بغیر پیسے لئے روانہ ہوئے۔ اس تجربہ سے ہمیں اندازہ ہوا کہ ان جیسے لوگوں کی وجہ سے شرطے تمام پاکستانیوں کو پریشان کرتے ہیں۔

جتنے دن مکّہ میں رُکے زیادہ تر وقت کعبہ کے صحن یا حرم میں گزارا۔ پورا حرم ٹھنڈا رکھا جاتا ہے۔ ہر طرف پانی کے کولر، گلاس، آبِ زم زم سے بھرے رکھے ہوتے ہیں۔ سعی کے بعد آبِ زم زم لینا بہت دشوار کام ہے۔ ویسے خریدنے کے لئے بوتلوں میں مل جاتا ہے۔ ہم نے بھی ایک بوتل خرید لی کہ زیادہ وزن لے کر جانہیں سکتے تھے۔ دوسروں کو دیکھا جو بہت خریداری کر رہے تھے کہ جیسے میلے پر آئے ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ تبرّک سمجھ کر چیزیں خریدتے ہوں کہ اللہ نے سب کا رزق کسی بہانے سے اُتارا ہے اور مکّہ نشینوں کے لئے حج کا زمانہ نعمتِ خداوندی ہے۔ حج کے بعد یہاں سے بہت سے حاجی مدینہ منوّرہ چلے جاتے ہیں جب کہ دوسرے حضرات حج سے پہلے ہی وہاں ہوکر آچکے ہوتے ہیں سو یہ اپنے ملک واپس چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اب مدینہ جانا تھا، لیکن پہلے ہمیں جدّہ میں ایک صاحب ''افضل بھائی'' کے گھر دعوتِ حج پر جمع ہونا تھا۔

مدینہ منوّرہ کا سفر

کعبہ کے باہر جس ٹیکسی والے سے بات کریں وہ ہمیں مدینہ لے جانے کے لئے تیار، لیکن جدّہ

لے جانے کے لئے نہیں۔ حد یہ تھی کہ مکّہ کے عام شہری بھی اپنی کاروں کو مدینہ کی سواریوں کے لئے کرایہ پر چلا رہے تھے۔ ہم افضل صاحب کو فون کرنے کی کوشش میں ایک فون کال سنٹر کی لائن میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ کھڑے رہے۔ اب باری آئی تو پہلے تو فون کا سلسلہ مل کر نہ دے۔ اور پھر ملا تو اُن کے گھر سے کوئی فون نہ اٹھائے۔ ساتھ میں کال سنٹر والا بھی بے تاب ہونے لگا کہ اُس کی آمدنی رُکنے لگی تھی۔ اب یہاں فون نہیں ملا تو ہم نے لاس انجلس فون کیا۔ اُدھر معلوم ہوا کہ ہمارے بھائی کی بیٹی کہیں گری تھیں اور ان کے ہاتھ کی ہڈّی ٹوٹ گئی تھی۔ یہاں سے امریکہ کی پرواز کا دن مخصوص تھا، پہلے جا ہی نہیں سکتے تھے۔ لہذا فیصلہ یہ ہوا کہ مدینہ چلیں کہ یہ ضروری ہے۔ ایک سواری کی، نمعلوم کس کی کار تھی جو یہ صاحب ٹیکسی بنا کر چلا رہے تھے کہ حج کے زمانے میں جو بھی پیسہ بن جائے اور حاجیوں کی ضرورت بھی پوری ہو جائے، بہتر ہے۔ مدینہ کی سڑک مزید چوڑی کر دی گئی تھیں، دو رویہ تھی، امریکی فری وے کی طرح کی۔ ہم مدینہ میں ٹھہرنے کا بندوبست لاس انجلس کے ٹریول ایجنٹ کے ذریعے کروا چکے تھے۔ یہاں پہنچے تو اُس جگہ کا نام نشان نہیں، اور جو شخص یہاں اس ایجنٹ کا نمائندہ تھا، وہ بھی ندارد۔ ہم نے خود ہی ٹھہرنے کا بندوبست کیا۔ ویسے جب لاس انجلس واپس آئے تو ایجنٹ نے ہمارے مدینہ کے ہوٹل کے پیسے واپس کر دیئے تھے اور بہت معذرت کی تھی۔

مدینہ شام کو پہنچے تھے اور مجمع میں کندھوں سے کندھے ٹکرا رہے تھے۔ آتے ہی غسل کیا، کھانا کھایا، وضو کیا اور مسجدِ نبوی میں حاضری دی۔ ہم نے دیکھا کہ مسجد کے آس پاس ابھی تک توسیع ہو رہی تھی اور بہت کام ہو رہا تھا۔ ہم جب دس سال پہلے ۱۹۷۹ء میں یہاں آئے تھے تب جنّت البقیع اور سادات کی آبادی کو مسمار کیا جا رہا تھا اس توسیع کے لئے۔ مسجد اب بہت بڑی ہو چکی تھی۔ اُس وقت یہاں ایک ہوٹل تھا فندقِ ظہور، لیکن یہ اب گرایا جا چکا تھا۔ اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہاں بہت ساری دوسری عمارتیں بھی گرا کر یا تو مسجد کی توسیع میں کام آ گئی تھیں یا ان کی جگہ بڑے اور عالیشان ہوٹل بن رہے تھے۔ جنت البقیع کا احاطہ بڑھ چکا تھا اور نہایت کشادہ پیدل راستے بن چکے تھے اور ان راستوں کے ساتھ نئی دُکانوں کے نہایت معقول کھوکھے لگے ہوئے تھے۔ عورتوں کے لئے ایک الگ، نیا چھجہ یا سائبان سا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ حضورؐ کے روضہ کے آس پاس کتابوں کی الماریاں نہیں تھیں۔ بی بی سیدہ زہراؑ کا حجرہ بھی حضورؐ کے روضہ سے ملحق تھا، مستورات پہلے اسی حجرے کے برابر نماز ادا کرتی تھیں۔ اس حجرے کے برابر ایک جگہ تھی جسے صحنِ علیؑ کہا جاتا تھا اور یہاں مرد نمازِ سنّت ادا کرتے تھے۔ مسجد میں جہاں چودہ ستون ہیں، اس جگہ کے بیچ میں لکڑی کی ایک دیوار کھینچ کر اسے دو

حصّوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ روایت ہے کہ یہاں مرد اور عورتوں کو ان چودہ ستونوں پر نماز ادا کرنا ضروری ہے۔ ان ستونوں میں ستونِ علیؑ، ستونِ عائشہؓ، ستونِ وفود وغیرہ ہیں۔ اب اِس دیوار کے بعد کیسے پتہ چلے کہ ستون کدھر ہیں اور نماز کہاں ہو۔ ہم نے نیت کر کے انہی سات ستونوں پر نماز ادا کی جو ہمارے حصّے میں آئے تھے۔ یہ انتظامی اور شرعی غلطی تھی۔ ہمیں خبر نہیں کہ کتنے لوگ ناواقفیت سے نقصان میں رہے ہونگے۔ بابِ جبرئیل سے اندر داخل ہونے کے لئے بھی اوقات مقرر کر دیئے گئے تھے۔

مسجد میں انتظام یہ تھا کہ ایک گروہ میں مرد حضرات روضۂ رسولؐ کی زیارت کر لیں، اور ایک میں خواتین، یکے بعد دیگرے۔ اب جب عورتوں کی باری آئی تو عورتوں کا ایک ریلا سا چلا۔ ہم اپنی بہن کو پکڑ کر انہیں سنبھالنے لگے کہ ہماری چادر ہمارے گلے میں پھنسی، اور اسی میں بہن بھی الجھ گئیں۔ اپنی جگہ ہم دونوں ہی رُک گئے۔ جب گردن کا پھندا ذرا سا ڈھیلا ہوا تو خوشی ہوئی، ہمیں ابھی فوت ہونے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اندر ہر عورت بے چین تھی کہ جالی سے حضورؐ کے روضہ کے اندر جھانک کر زیارت کر لے۔ مگر اب قرآنِ پاک رکھنے کے لئے اوپر تک خانے بنے ہیں، زیارت نہ ہو سکی۔ سب نے انہی حالات میں نمازیں پڑھیں۔ دوسری زیارتیں کیں۔ مقامِ جبرئیل بھی دیکھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت جبرئیل وحی لاتے تھے۔ صفا کا مقام دیکھا جو کہ روایت کے مطابق وہ جگہ ہے جہاں حضورؐ کے زمانے میں غریب مسلمان مہاجر اس وقت تک ٹھہرائے جاتے تھے جب تک کہ وہ اپنا کھانے پینے کا بندوبست نہیں کر لیتے تھے۔ ممبرِ رسول اور رسول کی ضریح کے درمیان ریاض الجنّہ دیکھا۔ ممبر رسول دیکھا کہ جس پر بیٹھ کر رسولؐ کریم خطبہ دیتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق ایک خطبہ کے دوران حضرت امام حسینؑ حضرت فاطمہؑ کے حجرے سے نکل کر آ رہے تھے کہ ان کا لباس پیروں میں پھنسا اور حضرتؑ اس سے الجھ کر گرنے کو تھے کہ رسولؐ نے خطبہ روک دیا اور نیچے اتر کر امامؑ کو گرنے سے بچا لیا۔ غرض کچھ دیر مسجدِ نبویؐ میں عبادت کر کے باہر آئے اور یہاں سے جنت البقیع گئے۔ یہاں عورتوں کے لئے ایک سائبان بنا ہے، وہیں بیٹھ کر پڑھتے رہے۔ یہاں یورپ کی طرح کبوتروں کو دانہ ڈالنے کی جگہ بنا دی گئی ہے، سو مذہب میں سیاحت کا عنصر آ گیا ہے۔ مرد اندر جاتے ہیں بقیہ نشانیاں ڈھونڈنے کے لئے، مگر عورتیں نہیں جا سکتیں۔ حضرت ابو طالب کے مکان بھی گئے جو اب ایک کُتب خانہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

اگلے دن ہم نے ایک راہبر کو ساتھ لیا اور زیارات کیں۔ یہاں کی بقیہ مساجد دیکھیں۔ ہر جگہ ٹھہر کر

نماز ادا کی۔لیکن امیر حمزہؓ کا مکان تو نہ ملا، کہ صرف نشانِ قبر چھوڑ دیا گیا تھا۔آس پاس کچھ عورتیں چادرِ یمانی اور اِسی طرح کی چیزیں فروخت کر رہی تھیں۔ وہاں تبرکات بیچتی ہوئی عورتیں پہلی مرتبہ نظر آئیں۔خبر ہوئی کہ یہ سعودی نہیں تھیں۔سعودی عورتیں تو حج میں بھی بند کاروں میں آتیں، صحنِ کعبہ میں احرام باندھتیں، اور وہیں سے طواف ہوتا۔ یہاں کے شہزادے اور امیرزادے بھی اسی طرح سہولتوں کے ساتھ طواف کرتے۔ یہی صورتِ حال مدینہ میں بھی تھی۔ دارالقضایا مدینہ کی عدالت بھی دیکھی جو کبھی حضرت ابوایوب انصاری کا گھر تھا اور رسولِ کریمؐ یہاں ٹھہرے تھے۔ پھر ہم نکلے مکتبِ شیخ عارف حکمت کی تلاش میں جو روایت کے مطابق حضرت امام حسینؓ کا گھر تھا اور بابِ جبرئیل کے جنوب میں تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔لیکن ہمیں یہ مل نہ سکا۔شام دیر ہم ہوٹل واپس آئے۔کچھ آرام کیا، واپس مسجدِ نبوی گئے اور ساری رات وہیں عبادت کرتے رہے۔

ہمیں ۲۰/ جولائی کو مکّہ واپس آنا تھا۔۲۲/ جولائی کی رات کو امریکہ واپسی تھی۔اب بھائی صاحب ہوٹل کا حساب چکانے گئے تو ہم اور ہماری بہن سامنے حبیب بنک سے اپنے ٹریولرز چیک کے سعودی ریال لینے چلے گئے۔ہمیں ۱۰۰/ڈالر کے ۳۹۰/ ریال ملے۔ یہاں سے ہم جلدی جلدی واپس آنے لگے۔حج کا ہجوم ختم ہونے لگا تھا۔لوگ اپنی دُکانوں کے آگے پانی ڈال کر فرش دھو رہے تھے۔ہم سب کی آوازیں ٹھنڈا پانی پی پی کر اور برف چباتے ہوئے بیٹھ گئی تھیں، اور پھر تھکن بھی جسم میں اچھی طرح بیٹھ چکی تھی۔اب ہم ذرا تیز چلے تو پیر پانی کی وجہ سے پھسلوان فرش پر پھسلا اور ہم گر گئے اور چٹ سے آواز آئی۔ دیکھا تو گھٹنا مڑا ہوا تھا۔آس پاس کے کسی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا کہ نامحرم کو ہاتھ کیسے لگائیں۔ ہماری بہن آگے نکل گئی تھیں۔ انہوں نے خود ہی مڑ کر دیکھا تو واپس آئیں اور اٹھانے کی کوشش کی۔اب ہم سے اٹھا نہیں گیا۔جیسے تیسے کر کے ہم اپنے ایک رشتہ دار کی کار تک آئے۔ یہاں انہوں نے ہمارے گھٹنے پر برف رکھی کہ موچ آ گئی ہے، اس سے ٹھیک ہو جائیگی۔ ہمارے بھائی نے اتنی دیر میں ہوٹل کا حساب کتاب ختم کر لیا تھا اور ہم سب طوافِ وداع کے لئے کعبہ شریف میں دوبارہ گئے کہ تمام محترم جگہوں کو بوسہ دیا جائے۔ہم نے سیڑھیاں تو چڑھ کر طے کر لیں، لیکن حرم میں بیٹھے روتے رہے۔سب نے کہا کہ تمام ارکان تو ادا ہو چکے ہیں، اب آپ آرام کریں۔ہم اسی طرح جدّہ واپس آئے۔تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور ہم پریشان تھے کہ واپسی کیسے ہوگی۔

شام تک ہمیں اندازہ ہو گیا کہ ہسپتال جانا ضروری ہے۔اگر بوجہ تکلیف ہماری پرواز نکل جاتی تو

دوسری پرواز ملنا مشکل تھا۔ہسپتال بہت قائدے کے تھے، بالکل امریکی طرز کے۔ یہاں ایکسرے ہوا تو معلوم ہوا کے گھٹنے کی چھوٹی ہڈی میں باریک سا شگاف (فریکچر) تھا۔ پردے کا نظام ایسا کہ ڈاکٹر آیا تو پہلے آنے کی اجازت لی اور نرس ساتھ رہی۔تمام عملہ غیر سعودی، مگر مسلمان تھا۔آدھے گھنٹے میں پلاسٹر چڑھا دیا گیا۔ہم سے کہا کہ اگر دو دن میں یہ ہڈی آپس میں صحیح جگہ پر بیٹھ گئی تو سفر کر سکتے ہیں ورنہ نہیں۔ یہ پلاسٹر عارضی تھا۔ دوسرے دن دوبارہ ایکسرے ہوا تو ہڈی صحیح بیٹھ گئی تھی۔اب پکا پلاسٹر کیا جو گھٹنے کے اوپر سے ایڑی تک تھا۔

۲۲/جولائی کو ایئرپورٹ پہنچے تو وہاں وہی آپا دھاپی ہو رہی تھی۔ ہمارے پیر کی تکلیف نے ہمیں مزید پریشان کر رکھا تھا۔لیکن پیر کی یہ چوٹ ہم چاروں کے بہت کام آئی۔ہم وہیل چیئر پر تھے اور اس کی وجہ سے ہر جگہ ہمیں سب سے پہلے آگے جانے دیا گیا۔ جہاز میں بھی ایسی نشست ملی جہاں پیر سیدھا رکھنے کی جگہ تھی کہ ہم گھٹنا موڑ نہیں سکتے تھے۔فضائی میزبان خاص طور پر ہماری خاطر مدارات کرتی رہیں۔ہم نیویارک ۲۳/جولائی کو پہنچے۔ یہاں پہنچے تو ہمیں دخول (امیگریشن) پر بتایا گیا کہ ہمارا امریکہ کا ویزا ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے گھٹنے کی صورتِ حال دیکھتے ہوئے انہوں نے ہمیں پھر یہیں ایئرپورٹ پر ہی ویزا دے دیا جو کہ سعودی ایئرلائنز کے عملہ کے مطابق ایک انہونی فیصلہ تھا۔ ویزا کی فیس صرف ۵۰/ڈالر لی گئی تھی۔ باہر نکلے تو ہمارے داماد موجود تھے اور یہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ یہ کوئینز میں رہتے تھے جو جان ایف کینیڈی ایئرپورٹ کے قریب ہی ہے۔تھوڑی دیر آرام کر کے اور تبرکات سب کو تقسیم کر کے ہم پھر ہوائی اڈہ کی طرف چلے۔ یونائیٹڈ ایئرلائنز کی رات کے ۹/بجے کی پرواز تھی جس سے ۲۴/جولائی ۱۹۸۹ء کی صبح کو لاس انجلس پہنچے جہاں ہمارے بیٹے ڈاکٹر اعزاز اور دوسرے بھانجے بھانجیاں استقبال کے لئے موجود تھے۔

لاس انجلس ایئرپورٹ: حج سے واپسی

دوسرے دن پھر ٹانگ کا ایکسرے ہوا اور اب پلاسٹر کاٹ کر ہمیں ایک ایس پٹی باندھی جیسے کہ کرکٹ کھیلنے والوں کے پیڈ ہوتے ہیں۔ اس سے آرام یہ تھا کہ جب ضرورت ہوئی اسے کھول کر الگ رکھ سکتے تھے۔ یہاں لاس انجلس میں ہم اور اعجاز اکیلے رہتے تھے۔ اسی گھٹنے کی چوٹ میں ہم نے کھانا پکانا اور دوسرے کام کرنا جاری رکھا۔ محرّم بھی اسی میں گزرے اور محرّم کے آخر میں ہم پھر یونائیٹڈ ایئر لائنز سے سان فرانسسکو اپنے بیٹے شمس کے پاس آ گئے۔ اور اسی طرح نو ماہ گزر گئے پیر کے صحیح ہونے میں۔ چونکہ ٹب کے اندر جا کر نہانا بہت مشکل تھا، اس لئے کچھ عرصہ اسپنج سے صفائی کر کے گزارا۔ جب تک پیر میں تکلیف رہی، سفرِ حج زیادہ یاد آیا۔ یہ سطور ہم ۲۹ر دسمبر ۱۹۹۶ء میں السوبرانتے میں شمس کے گھر لکھ رہے ہیں۔ پھر بھی یاد ہے کہ حج کے بعد ابھی تک خواب میں ہم نے خود کو کبھی تو حرم شریف میں طواف کرتے دیکھا تو کبھی مدینہ میں حضور کے قدمِ اقدس پر۔ اب بھی یاد ہے وہ کیفیت۔ مختلف لوگوں سے ملنا جلنا، پاکستانی بھی ملے، غیر پاکستانی بھی۔ زبان کی مشکل ہوئی تو کسی نہ کسی طرح دور ہوگئی کہ سب ایک دوسرے سے ملنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اجتماع کی برکت سمجھائی ہے۔ نماز باجماعت پڑھنا، روزے اور حج، دوسری مذہبی تقریبات، سب ہی اس اجتماعی فرائض کے گرد ہیں۔ خداوند نے جو رِزق و روزی اور علم دیا ہے وہ لازم ہے کہ کسی بہانے ایک سے دوسرے کو پہنچے۔ اب امریکہ میں بھی اسی چیز پر زور دیا جاتا ہے کہ جب عوام خرچ کرنا کم کر دیتے ہیں تو حکومت کوشش کرتی ہے کہ عوام گھر سے باہر نکلیں اور خرچ کریں تاکہ ملک میں پیسے کی گہما گہمی رہے۔ اسی طرح خدا نے زکوٰۃ، خمس، صدقہ، خیرات اور دوسری مدیں رکھی ہیں تاکہ پیسہ صرف اُن ہی کے پاس نہ جائے جو پہلے ہی سے مالی بہتری میں ہوں، بلکہ اُن کے پاس بھی جائے جو قسمت کے زوال سے گزر رہے ہوں۔ امریکہ میں ہم نے یہی دیکھا کہ یہاں بھی میڈی کیئر، سوشل سیکیوریٹی، انکم ٹیکس، اور سوشل ویلفیئر وغیرہ انہی اسلامی اصولوں کے دوسرے نام ہیں۔ گھبرانا نہیں چاہیئے کہ بغیر مشکل اُٹھائے کچھ نہیں ملتا۔ چاہے دوزخ ہو یا جنت، دنیا ہو یا دین یا علم و دانش ہو، ایک سلسلہ ہے ازل سے ابد تک چلے گا کبھی کسی صورت میں، کبھی کسی رنگ و طور و طریق میں۔ بس ہمیں بھی تسکین ہوتی ہے کہ اتنا بڑا مرحلہ طے ہوگیا۔ خداوندِ عالم نے ہمیں ساٹھ سال کی عمر ہونے سے پہلے ہی اتنی بڑی سعادت سے نوازا۔ خدا سب کو یہ توفیق دے، آمین!